

# گرانی اور اسٹیٹ بینک کا زری پالیسی موقف

گورنر، بینک دولت پاکستان، شاہد ایچ کاردار

وفاق ایوان ہائے تجارت و صنعت، کراچی سے خطاب

پیر 13 دسمبر 2010ء

2008-09ء کے عالمی مالی اور معاشی بحران کے بعد معاشی استحکام، خاص طور پر قیمتوں کے استحکام کو یقینی بنانے میں زری پالیسی کا کردار مزید ابھر کر سامنے آیا ہے۔ زری پالیسی کی موزوں حکمت عملی کیا ہونی چاہیے، اس بارے میں اتفاق رائے پیدا ہونے میں تو کچھ وقت لگے گا، تاہم عالمی پالیسی کے حلقوں میں تقریباً تمام ماہرین معیشت اور سینٹرل بینکرز، چاہے وہ موجودہ زری پالیسی کی حمایت کرتے ہوں یا اس پر تنقید کرتے ہوں، اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مہنگائی کو قابو کرنا زری پالیسی کا بنیادی مقصد ہے اور ہونا چاہیے۔

پاکستان میں بھی پچھلے چند سال کے دوران گرانی کی وجوہات اور زری پالیسی کے کردار کے بارے میں اسی طرح کی بحث کی جارہی ہے لیکن اس کا پس منظر اور پیمانے مختلف ہیں۔ زیادہ تر مہنگائی متفق ہیں کہ مہنگائی جو تقریباً تین سال سے مسلسل بہت زیادہ ہے، ہمارے ملک کو درپیش اہم معاشی مسائل میں شامل ہے۔ لیکن انہیں شک ہے کہ زری پالیسی گرانی کو کم کرنے میں مدد کر سکتی ہے یا نہیں۔ بعض مہنگائی کے سبب تھے ہیں کہ یہ صرف رسد یعنی سپلائی کا معاملہ ہے اور زری پالیسی گرانی کو روکنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ کچھ لوگ مالیاتی کمزوری اور بھاری بجٹ خسارے کو مہنگائی کی اصل وجہ بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ زری پالیسی حکومت کے رویے پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

آج میں اس اہم موضوع پر آپ کو اپنے خیالات اور نقطہ نظر سے آگاہ کرنا چاہوں گا۔ اسٹیٹ بینک اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ زری پالیسی کی مربوط حکمت عملی پر عملدرآمد کرنا اس وقت تک کافی نہیں ہوگا جب تک اس حکمت عملی کو اچھی طرح سمجھنا نہ جائے، دوسروں تک پہنچایا نہ جائے اور زری پالیسی کے نتائج کی ذمہ داری واضح طور پر طے نہ کی جائے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں پاکستان میں گرانی کے مخصوص پہلوؤں پر بات کروں اور اسٹیٹ بینک کی جانب سے موجودہ زری پالیسی اختیار کرنے کی وجوہات بتاؤں، تین نکات پر گفتگو کرنا چاہوں گا۔ ان تینوں کا تعلق معاشی تصورات سے ہے۔ پہلا نکتہ بنیادی سطح پر قیمتوں کے تعین کے عمل سے ہے۔ دوسرا، مہنگائی کا رویہ۔ تیسرا، پالیسی سازوں کو جن سمجھوتوں (trade-offs) کا سامنا ہوتا ہے ان کو سمجھنا۔ اس بحث سے ہمیں نہ صرف زری پالیسی کے دائرے اور تاثیر کو سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ یہ بھی سمجھ میں آئے گا کہ اسٹیٹ بینک کو اپنے مقاصد کے حصول میں کن مسائل اور دشواریوں کا سامنا ہے۔

معیشت میں گرانی کی وجوہات پر بحث سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کسی چیز کے پیدا کرنے کی لاگت اور فرم کی سطح پر اس کی قیمت کے درمیان کیا تعلق ہوتا ہے۔ فرض کریں کسی چیز کو پیدا کرنے کی لاگت 10 روپے ہے جس میں اجرت، خام مال، مشینیں خریدنے اور نصب کرنے کی لاگت اور دیگر اخراجات شامل ہیں۔ پیدا کنندہ (producer) اپنا کاروبار جاری رکھنے اور منافع کمانے کے لیے اسے 10 روپے سے کچھ زیادہ رقم 'x' میں بیچے گا۔ 'x' روپے کو عموماً مارک اپ کہا جاتا ہے اور اس کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ انڈسٹری میں کس حد تک مسابقت ہے، پراڈکٹ کیا ہے، پیدا کنندگان (producers) اور حکومتی اتھارٹیز کی انتظامی کارکردگی کیسی ہے، مناسب سپلائی چین انفراسٹرکچر موجود ہے یا نہیں وغیرہ۔

اس سادہ مثال میں اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ عاملین پیدائش (factors of production) میں پیداواریت (productivity) کا کردار کیا ہے، چاہے وہ کارکن ہوں یا مشینیں۔ اگر پیداواریت کم ہے اور مزید کم ہو رہی ہے تو آخری قیمت زیادہ ہوگی چاہے عاملین پیدائش کی لاگت وہی رہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ کارکنوں کی پیداواریت بڑھا کر اور ٹیکنالوجی کا بہتر اور موثر استعمال کر کے قیمت مستحکم رکھی جاسکتی ہے بلکہ کم بھی کی جاسکتی ہے۔ جس زری پالیسی کا مقصد مجموعی گرانی کی روک تھام اور اس کے نتیجے میں قیمتوں کا استحکام ہوتا ہے وہ پیداواری لاگت پر دباؤ کم کر دیتی ہے لیکن پیداواریت نہیں بڑھا سکتی۔ جو عوامل پیداواریت بڑھاتے ہیں ان میں امن وامان کا استحکام، صحت مند اور ہنرمند لیبر فورس، موثر گورننس اور توانائی کی بلار کاؤٹ فراہمی شامل ہیں۔

بہت چٹلی سطح پر قیمتوں کے تعین کا عمل مفید ہوتا ہے لیکن مجموعی سطح پر قیمتوں یا گرانی پر بحث پر اہم ہے۔ اس حوالے سے تین موٹی موٹی باتیں قابل ذکر ہیں: (i) مہنگائی کے رجحانات کے جاری رہنے کی توقعات، (ii) مجموعی ملکی طلب اور معیشت کی اس طلب کو پوری کرنے کی استعداد کے درمیان فرق، اور (iii) لاگت کا بڑھنا یا رسد دھچکے۔

گرانی آئندہ کس طرف جائے گی، اس بارے میں جو توقعات ہوتی ہیں وہ اصل مہنگائی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ان توقعات کی بنیاد ماضی کی گرانی پر ہو سکتی ہے یا یہ ہو سکتی ہے کہ حکومتی پالیسیوں کے مہنگائی پر کیا اثرات پڑیں گے یا نہیں پڑیں گے۔ مثال کے طور پر اگر کچھ عرصے کے لیے کسی معیشت میں بہت زیادہ گرانی ہو جاتی ہے جو بڑھتی رہتی ہے تو لوگ توقع کریں گے کہ یہ رجحان جاری رہے گا اور وہ زیادہ اجرت چاہیں گے تاکہ ان کی قوت خرید کم از کم برقرار تو رہے۔ عموماً ایشیا اور خدمات کی قیمتوں میں اضافے کے مقابلے میں اجرتوں میں اضافے کی رفتار کم ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے اور حکومتی اتھارٹیز پر دباؤ پڑتا ہے کہ مہنگائی کو کنٹرول کرے اور مستحکم رکھے۔

چنانچہ ماضی اور مستقبل سے ہم آہنگ معاشی پالیسیاں ترتیب دینے کے حوالے سے گرانی کی توقعات کو سنبھالنا ایک اہم فریضہ ہے جو دنیا بھر کے بینٹرنل بینک انجام دیتے ہیں۔ بہر حال عوام کو یہ یقین دلانے میں کہ حکومت مہنگائی کنٹرول کرنے کے لیے کام کر رہی ہے دیگر پالیسیوں کا کردار بھی کم اہمیت نہیں رکھتا جیسے مالیاتی (fiscal) پالیسی۔ اگر اس حوالے سے اعتبار قائم نہ کیا جائے تو غیر یقینی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور عوام اور فرمیں درست فیصلے نہیں کر پاتیں۔ اس کی وجہ سے پھر گرانی کا دباؤ بھی پیدا ہوتا ہے۔

مہنگائی پر پیداواری فرق کے اثرات کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف مجموعی طلب گرانی کی توجیہ نہیں کر سکتی۔ اس کا موازنہ معیشت کی اس طلب کو پیدا کرنے اور فراہم کرنے کی صلاحیت سے ہونا چاہیے۔ چنانچہ مجموعی طلب قدرے کنٹرول میں ہو تب بھی معیشت میں گرانی کا دباؤ ہو سکتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر معیشت کی پیداواری استعداد گھٹ رہی ہے تو مجموعی طلب کی اسی سطح پر مہنگائی قائم رہ سکتی ہے۔

تاہم موجودہ پیداواری فرق کو چنانچہ معاشی نیچرز کے لیے مشکل کام ہے۔ اس کے لیے معیشت کی استعداد یا امکانات کا اندازہ کرنا ہوتا ہے جس کی پیمائش کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ مجموعی طلب پر بروقت اعداد و شمار سے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، جیسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر کے صرفے (consumption) اور سرمایہ کاری کے اخراجات۔ اتھارٹیز عموماً ان دستیاب اظہاریوں (indicators) پر انحصار کرتی ہیں جو مجموعی طلب کے دباؤ اور معیشت کی پیداواری استعداد کو جانچنے میں مدد دیتے ہیں۔

مجموعی طلب کے اہم مفید اظہاریوں میں زری متغیرات (variables) جیسے پرائیویٹ سیکٹر اور فیکل اتھارٹیز کی قرضے کی طلب اور ملک کی زرمبادلہ کی پوزیشن کے رجحانات شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر معیشت میں زیادہ تر تیلین دین پیسے کی ہوتی ہے، چاہے اس کا ریکارڈ رکھا جا رہا ہو (documented) یا نہیں۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ گرانی کے دباؤ کے لیے اکثر اس قسم کے فقرے استعمال کیے جاتے ہیں کہ ”مہنگائی ہمیشہ اور ہر جگہ مؤثری وجوہ سے ہوتی ہے“ اور ”بہت زیادہ پیسہ بہت کم اشیا کا تعاقب کر رہا ہے“۔

رسدی دھچکے کیا ہو سکتے ہیں: پیداواری لاگت کو پہنچنے والے غیر متوقع دھچکے، قدرتی آفات جو پیداوار اور سپلائی چین کو متاثر کریں، اور انتظامی اقدامات کے ذریعے منڈی میں مداخلت۔ یہ عوامل قیمتوں پر عارضی اثر ڈالنے ہیں لیکن قیمتوں کی تبدیلی کی شرح یعنی گرانی کو متاثر نہیں کرتے۔ اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ دھچکے باقاعدہ وقفوں سے معیشت میں آتے رہیں جیسا کہ پاکستان میں بجلی اور پٹرولیم کی سبسڈیز میں کمی کے حوالے سے ہوا ہے، تو ان کا اثر دوسری قیمتوں تک پہنچ جاتا ہے اور گرانی کی توقعات کو بڑھا دیتا ہے۔

آخری نکتہ یہ ہے کہ معاشی پالیسی کے ہر فیصلے میں اہم متغیرات (variables) کے درمیان سمجھوتہ (trade-off) ہوتا ہے۔ ہم قیمت ادا کیے بغیر اپنی خواہش کے مطابق ہر چیز حاصل نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر، ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ دستیاب پیداواری استعداد کے لحاظ سے مجموعی طلب میں اضافے کے نتیجے میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ سخت زری پالیسی کے ذریعے مہنگائی کو روکنے کی کوشش سے معاشی سرگرمیاں کم ہو جاتی ہیں۔ اس حوالے سے زیادہ تر پرائیویٹ سیکٹر میں تبدیلیاں آتی ہیں، بہت بلبلہ پبلک سیکٹر کے۔

اسی طرح بیرونی کھاتوں (external accounts) میں خرابی، چاہے وہ ادائیگیوں اور وصولیوں کے درمیان فرق کی وجہ سے ہو یا اسے پورا کرنے کے لیے رقم کی کمی کی وجہ سے شرح مبادلہ (exchange rate) میں رد و بدل کے بغیر جاری نہیں رہ سکتی۔ مطلوبہ مقدار میں بیرونی کرنسی فراہم کر کے شرح مبادلہ میں استحکام لانے کی کوششیں شرح سود میں اضافے کے بغیر پائیدار بنیادوں پر کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب ملک سے باہر جانے والی بیرونی کرنسی آنے والی بیرونی کرنسی سے زیادہ ہو تو مرکزی بینک کی جانب سے بیرونی کرنسی کے ادخال (injection) کے لیے ملکی کرنسی کی خریداری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ملکی کرنسی کی سیالیت (liquidity) کی دستیابی کم ہو جاتی ہے اور مارکیٹ کی شرح سود میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ سیالیت کا دباؤ کم کرنے کے لیے مرکزی بینک اپنے بازار کے سود (Open Market Operations) کے ذریعے ملکی کرنسی کا ادخال کر سکتا ہے۔ تاہم یہ حکمت عملی اس وقت مشکل ہو جاتی ہے جب باہر جانے والی بیرونی کرنسی آنے والی بیرونی کرنسی سے زیادہ رہے اور اگر ملکی کرنسی وافر مقدار میں دستیاب ہونے کی وجہ سے ملک میں مہنگائی بڑھنے لگے۔

یہی اصول مالیاتی معاملات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ حکومتیں طویل عرصے تک اپنے محاصل سے زیادہ خرچ کرنے کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتیں۔ یہ فرق کم کرنے کے لیے جو قرضہ درکار ہوتا ہے اس کی کچھ قیمت ہوتی ہے، یعنی مستقبل میں سودی ادائیگیاں۔ اخراجات میں اضافے کے تناسب سے محاصل میں اضافہ نہ کر سکنے سے مسئلہ مزید گہرا ہوتا ہے کیونکہ سود کا خرچ بڑھتا رہتا ہے چنانچہ مزید قرض لیا جاتا ہے اور یوں قرض کو بوجھ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ محاصل میں اضافے کے اقدامات جیسے ٹیکس بڑھانا یا اخراجات گھٹانا جیسے سبسڈیز میں کمی سے پیداواری لاگت بڑھتی ہے اور امکانی طور پر مہنگائی بھی۔

جو بنیادی بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مؤثر پالیسی فیصلے کے لیے ضروری ہے کہ معیشت کے کسی حصے میں مؤثر تبدیلی آئے۔ اگر ضروری تبدیلی نہیں ہو رہی یا دوسری پالیسیاں اسے غیر مؤثر کر رہی ہیں تو فیصلے کا اعتبار کم ہو جاتا ہے جس سے غیر یقینی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پالیسی ساز معیشت کے مستقبل کے لیے ترجیحات کا ایجنڈا طے کریں، اسے عوام تک پہنچائیں، سیاسی اتفاق رائے پیدا

کریں، بروقت اور مربوط فیصلے کریں اور کئی سال کی مدت میں ایجنڈے پر عملدرآمد کریں۔ اس حکمت عملی کے کسی پہلو کے حوالے سے تاخیر یا غیر یقینی کیفیت کے نتیجے میں مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہوتے اور اہم ترجیحات کے درمیان سمجھوتے مشکل ہو جاتے ہیں۔

اب اس تصوراتی پس منظر میں جائزہ لیں کہ پاکستان میں مہنگائی کی موجودہ صورتحال کے کیا خواص ہیں اور اس مسئلے سے نمٹنے میں زری پالیسی کا کیا کردار ہے۔ مجموعی طور پر پاکستان کی معیشت جون 2007ء سے اکتوبر 2010ء تک 66 فیصد مہنگائی کے تجربے سے گزری ہے۔ یہ جون 2003ء اور جون 2007ء کے درمیان مہنگائی کی سطح سے، جو 36 فیصد تھی، تقریباً دوگنی ہے۔ یہ تین سال پچھلے تین برسوں سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟

پہلے تو آئیے اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لیے مہنگائی کے اعداد و شمار پر نظر ڈالیں۔ غذا کی قیمتوں سے شروع کریں۔ ان مدتوں میں غذائی گروپ کا رویہ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ مجموعی صارف اشاریہ قیمت (Consumer Price Index) میں غذائی گروپ کا 40 فیصد حصہ ہے۔ یہ درست ہے کہ جون 2007ء اور اکتوبر 2010ء کے درمیان غذائی ایشیا کی قیمتوں میں 88 فیصد اور جون 2003ء اور جون 2007ء کے درمیان 47 فیصد اضافہ ہوا۔ لیکن صارف اشاریہ قیمت گرائی میں دونوں مدتوں میں ان کا حصہ زیادہ مختلف نہیں، یعنی بالترتیب 56 اور 51 فیصد۔ مزید برآں ان مدتوں میں ایک ہی جیسی ایشیا غذائی گرائی میں 80 فیصد کے ذمے دار ہیں۔ ان میں گندم کا آٹا، چینی، تازہ دودھ، گوشت اور سبزیاں اہم ہیں۔ تو پھر کیا یہ غذائی گرائی صرف 'سپلائی شاکس' کی وجہ سے ہے؟ کیا کوئی اور چیز بھی ہے؟

مثلاً، گندم اور چینی کو دیکھئے۔ جون 2003ء اور جون 2007ء کے درمیان گندم کے 10 کلو آٹے کے تھیلے کی قیمت 85 روپے سے بڑھ کر 119 روپے ہو گئی تھی۔ اس طرح اس کی قیمت میں مجموعی طور پر 40 فیصد اضافہ ہوا۔ جو اس کے بعد کے تین برسوں میں بڑھ کر 260 روپے ہو گئی جبکہ اس کی قیمت میں مجموعی طور پر 120 فیصد اضافہ ہوا۔ لیکن گندم کی بین الاقوامی قیمتیں صرف 22 فیصد بڑھ سکیں۔ پھر، کیا ہوا؟ کیا پیداوار میں کمی ہو گئی یا خام مال کی قیمتیں بڑھ گئیں؟ ہم سب جانتے ہیں کہ حکومت نے گندم کی 'امدادی قیمت' بڑھادی تھی۔ کیا ہم اسے رسد کا مسئلہ سمجھیں یا پالیسی فیصلہ؟ چینی کی قیمتوں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی دیکھنے میں آیا۔ جون 2003ء اور جون 2007ء کے دوران 46 فیصد تک بڑھنے کے بعد چینی کی قیمتیں اس کے بعد کے سالوں میں 184 فیصد بڑھ گئیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قیمتوں میں ہونے والے اس اضافے کو صرف رسد کا مسئلہ نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً، حکومت کے پاس بینکاری نظام سے بھاری قرضے لیے بغیر گندم کی عالمی قیمت سے بلند سطح پر 10 ملین ٹن سے زائد گندم خریدنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ گندم اور چینی دونوں کی خریداری کے لیے حاصل کیے جانے والے قرضوں میں گذشتہ تین برسوں کے دوران 33 فیصد اضافہ ہوا جبکہ پہلے کے تین سالوں میں یہ 33 فیصد تک بڑھی تھی۔ اتنی بھاری مقدار میں قرضہ لینا مارکیٹ کی شرح سود پر دباؤ بڑھانے بغیر ممکن نہیں تھا۔ گندم، یوریا اور چینی کی خریداری کے لیے حکومت نے کاہنور سے 3 فیصدی درجے تک 382 ارب روپے کا قرض لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرح سود کے معاملے میں نجی شعبے کو ریاست سے مسابقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کے نتیجے میں دیہی علاقوں کو بھاری نقد قومات حاصل ہوئیں جسے انہوں نے مکمل طور پر صارفی اور دیگر غذائی ایشیا خریدنے کے لیے خرچ کیا۔ اس طرح ابتدائی طور پر جو مسئلہ رسد کا تھا وہ طلب کے مسئلے میں تبدیل ہو گیا جس نے مہنگائی کے بلند سطح پر رہنے کی توقعات پر منفی اثرات مرتب کیے۔

اجناس اور مجموعی طور پر قیمتوں کے تعین کے درمیان فرق کو سمجھنے کے لیے آئیے ہم پیٹرولیم مصنوعات، بجلی اور گیس کی قیمتوں کے ارتقاء پر نظر ڈالتے ہیں۔ روایتی طور پر حکومت مذکورہ اجناس کی قیمتوں پر بھاری سبسڈی دیتی رہی ہے۔ اس لیے، توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسے اقدامات سے ان مصنوعات کی قیمتیں قابو میں رہیں گی۔ لیکن سبسڈیز (Subsidies) کے خاتمے کی صورت میں ان کی قیمتیں بڑھ جائیں گی اور مجموعی مہنگائی پر اس کا خاصا اثر پڑے گا۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ ایسا ہو۔ مثلاً، جون 2003ء تا جون 2007ء کے دوران ڈیزل کی قیمتیں 20 روپے فی لیٹر سے بڑھ کر 38 روپے فی لیٹر ہو گئی تھیں۔ اس طرح اس میں مجموعی طور پر 90 فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ اکتوبر 2010ء تک یہ بڑھ کر 79 روپے فی لیٹر تک پہنچ گئیں جو اس میں مزید 108 فیصد اضافے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس میں فرق اتنا زیادہ نہیں کہ یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ گذشتہ تین برسوں کے دوران مہنگائی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے۔ پیٹرول کی قیمتوں کے معاملے یہ بات درست ہے کیونکہ جون 2007ء اور اکتوبر 2010ء کے درمیان ان میں 37 فیصد اضافہ ہوا جبکہ جون 2003ء اور جون 2007ء کے درمیان یہ 72 فیصد بڑھی تھیں۔ تاہم، حالیہ برسوں کے دوران بجلی کی قیمتوں میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے جو 62 فیصد بنتا ہے۔

پبلک سیکٹور اپریٹرز (PSEs) کی جانب سے قرضے لینا حکومت کے بجٹ اخراجات سے زراعت کی بجلی کمپنیوں کو براہ راست منتقلی کو ظاہر کرتا ہے اور ان میں جون 2007ء تا اکتوبر 2010ء کے دوران 305 فیصد اضافہ ہوا ہے جو 2003ء تا 2007ء کے درمیان صرف 17 فیصد تھا۔ زر (Money) اور مجموعی مہنگائی کی نمو میں اس کے حصے کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔ لیکن اگر ہم پی آئی (CPI) سے غذا اور توانائی کے گروپ کو نکال دیں تو ہمیں مہنگائی کے دباؤ میں خاصا اضافہ دیکھنے کو ملے گا۔ تیزی مہنگائی (Core Inflation) غیر غذائی غیر توانائی (این ایف این ای) اور تراشیدہ اوسط (Trimmed Mean) دونوں سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً، غیر غذائی غیر توانائی میں گذشتہ تین برسوں کے دوران 58 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ اس سے قبل 28 فیصد اضافہ ہوا تھا۔

کیا سبسڈیز میں کمی سے مالیاتی خسارے (Fiscal Deficit) اور مجموعی طلب کو کم کرنے میں مدد مل سکی ہے؟ بد قسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ بلکہ جون 2007ء اور جون 2010ء کے دوران مالیاتی خسارے میں 146 فیصد تک اضافہ ہوا جبکہ جون 2003ء اور جون 2007ء میں یہ 113 فیصد تک بڑھا تھا۔ اگر ہم انٹرسٹ پے منٹس (Interest Payments) کو لیں جسے مالیاتی مشکلات بڑھانے کا ایک اہم عامل کہا جاتا رہا ہے اور بنیادی خسارے (Primary Deficit) پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طلب کو بڑھانے میں حکومت کے مالیاتی اقدامات کا حصہ زیادہ ہے۔ گذشتہ تین برسوں کے دوران بنیادی

خسارے میں 3182 فیصد اضافہ ہوا جبکہ اس سے پہلے کے تین سالوں میں 140 فیصد تک بہتری دیکھنے میں آئی ہے۔ ایسا ہی کچھ محصولات خسارے (Revenue Deficit)، جاری اخراجات اور مجموعی محصولات کا فرق کے معاملے میں بھی دیکھنے میں آیا ہے جو 298 فیصد تک بڑھ گیا جبکہ اس سے قبل صرف 27 فیصد تک بڑھا تھا۔

طلب کو بڑھانے میں سرکاری شعبے نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس رجحان کا سب سے تشویشناک پہلو بڑھتے ہوئے مالیاتی خسارے کو پورا کرنے کے لیے بینکاری نظام پر بھاری انحصار ہے۔ جون 2007 اور نومبر 2010 کے دوران بینکاری نظام سے حکومتی قرضوں میں 187 فیصد اضافہ ہوا جبکہ جون 2003 اور جون 2007 میں 58 فیصد اضافہ ہوا تھا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ حکومت نے اسٹیٹ بینک سے قرضوں پر انحصار میں بھی خاصا اضافہ کر دیا ہے۔ اس وقت حکومت اسٹیٹ بینک سے 1500 ارب روپے سے زائد قرض لے چکی ہے جو آخر جون 2003 تک صرف 53 ارب روپے تھا۔ اگر حکومت اتنا قرضہ جدولی بینکوں (Scheduled Banks) سے لیتی تو شرح سود نجانے کس سطح پر ہوتی اور یقیناً یہ کافی بلند سطح پر پہنچ جاتی۔ چونکہ تعریف کے مطابق شرح سود ایسی قیمت ہوتی ہے جو کسی کو مستقبل کے وسائل حال میں استعمال کرنے کے بدلے دینی ہوتی ہے، اس لیے قرض لینا اور قرضوں کی سطح میں اضافہ شرح سود میں اضافے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے رجحانات کے تسلسل سے مہنگائی کی توقعات مضبوط ہو رہی ہیں جس کے نتیجے میں شرح سود بلند سطح پر ہے۔ اس لیے، اگر اسٹیٹ بینک کی موجودہ زری پالیسی (Monetary Policy) پر کوئی تنقید کی جائے تو وہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ یہ زیادہ سخت نہیں۔

اسٹیٹ بینک کی جانب سے قدرے نرم زری پالیسی اختیار کرنے پر ہماری تشویش کا سبب یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں نجی شعبے کے قرضوں میں کمی ہو جائے گی جس کے معاشی شرح نمو (Growth Rate) پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ مشکل حالات کا ادراک کرتے ہوئے اسٹیٹ بینک اپنی جانب سے توازن قائم کرنے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نجی شعبے کو معیشت میں ہونے والی تبدیلیوں کی ذمہ داری ہے اور قرضوں پر بلند شرح اور ان کی دستیابی میں کمی کے باعث نجی شعبے کے قرضوں میں کمی آگئی ہے۔ جون 2003 اور جون 2007 کے درمیان نجی شعبے کے قرضوں میں مجموعی طور پر 162 فیصد اضافہ ہوا تھا جبکہ جون 2007 اور نومبر 2010 کے درمیان یہ صرف 24 فیصد بڑھے تھے۔ مذکورہ صورتحال کے مستقبل میں معیشت کی پیداواری صلاحیت پر منفی اثرات مرتب ہوں گے جس کی وجہ سے مجموعی طلب میں کمی کو پورا کرنا اور مہنگائی میں کمی لانا مشکل ہو جائے گا۔

حکومت کے جدولی بینکوں اور اسٹیٹ سے قرضوں میں بھاری اضافے کے باعث بینکاری نظام کے کرنسی اور امانتوں کے تناسب (Currency to Deposit ratio) میں بھی گناؤ دیکھنے میں آیا ہے۔ جون 2003 اور جون 2007 کے دوران زیر گردش کرنسی میں 70 فیصد اور حکومتی امانتوں کے علاوہ بینکاری نظام کی مجموعی امانتوں میں 104 فیصد اضافہ ہوا۔ اس کے بعد کے تین برسوں میں زیر گردش کرنسی میں 82 فیصد اضافہ ہوا جبکہ امانتیں (Deposits) صرف 40 فیصد تک بڑھ سکیں۔ زیر گردش کرنسی کا مجموعی مہنگائی سے مضبوط مثبت تعلق موجود ہے جبکہ امانتیں بینکاری نظام کے لیے رقوم مہیا کرنے کا بڑا ذریعہ ہوتی ہیں۔ امانتوں میں کمی سے مارکیٹ کی سیالیت (Liquidity) کم ہو جائے گی جس سے شرح سود پراپر کی جانب دباؤ بڑھ جائے گا۔

معیشت کس طرح مجموعی طلب کے اس دباؤ سے عہدہ براہ ہونے میں کامیاب رہی؟ 2003 اور 2007 کے دوران نجی شعبے اور سرکاری شعبے کا حصہ متوازن تھا۔ اس سے قطع نظر معیشت کی دستیابی پیداواری گنجائش کے مقابلے میں مجموعی طلب کا دباؤ کافی زیادہ تھا۔ اس کی پیمائش تجارتی خسارے میں مجموعی طور پر 2605 فیصد نمو سے کی جاسکتی ہے۔ جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مہنگائی، شرح سود اور شرح مبادلہ (Exchange Rate) میں کیوں قدرے استحکام رہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ معیشت بڑی حد تک اس طلب کو پورا کرنے کے لیے بیرونی سرمائے پر انحصار کرتی رہی ہے جس کی عکاسی غیر ملکی سرمایہ کاریوں میں 1462 فیصد اضافے اور بینکاری نظام کے خالص بیرونی اثاثوں (Net Foreign Assets) میں 83 فیصد نمو سے ہوتی ہے۔

اگر ہم جون 2007 تا نومبر 2010 کی مدت پر نظر ڈالیں تو صورتحال بالکل مختلف معلوم ہوتی ہے۔ طلب کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے جواب میں اسٹیٹ بینک نے اپنی زری پالیسی (Monetary Policy) کو سخت کرنا شروع کیا اور اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ اجناس کی عالمی قیمتوں میں کمی کے باعث اس مدت کے دوران تجارتی خسارے میں صرف 18 فیصد اضافہ ہوا۔ اسٹیٹ بینک کی جانب سے سخت زری پالیسی کو جاری رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ غیر ملکی سرمایہ کاریوں میں 74 فیصد اور خالص بیرونی اثاثوں (NFA) میں 37 فیصد کمی آئی ہے۔ یہ الفاظ دیگر، مجموعی طلب میں کمی آئی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ معیشت میں اس طلب کو پورا کرنے کی صلاحیت اور اس فرق کو پورا کرنے کے لیے بیرونی ذرائع سے رقوم کی آمد میں بھی کمی آئی ہے۔

اگر اسٹیٹ بینک مذکورہ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اقدامات نہ کرتا تو گرانی کی صورتحال اور ملک کے ذخائر کی پوزیشن کہیں زیادہ بدتر ہو سکتی تھی۔ مثلاً، زر وسیع (Broad Money) اور مہنگائی میں اضافہ موجودہ سطح سے کہیں زیادہ ہو سکتا تھا اگر سرکاری شعبے کے ساتھ ساتھ نجی شعبے بھی بلا روک بینکاری نظام سے قرضے لیتا رہتا۔ کوئی بصریہ کہہ سکتا ہے کہ نجی شعبے کو سستے قرضے کی دستیابی سے پیداواری صلاحیت بڑھ جاتی جس سے پیداواری فرق کو کم کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ تاہم، گزشتہ تین برسوں کے دوران ملک میں امن و امان کی صورتحال بگڑنے اور توانائی کے شعبے میں مشکلات کی وجہ سے اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ مقامی وغیر ملکی سرمایہ کاری میں تیزی سے اضافہ ممکن ہے۔ پھر گرانی بڑھنے کی وجہ سے پیداوار لاگت بڑھنے کے باعث کاروبار غیر مسابقتی ہو سکتے ہیں۔

تو، ہم نے پاکستان میں مہنگائی کے محرکات کے بارے میں کیا سیکھا؟ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مہنگائی میں اضافے کی وجوہات میں سرکاری قیمتوں میں اضافہ، پیداواری فرق کا تسلسل اور ناپائیدار معاشی پالیسیاں شامل ہیں جنہوں نے مہنگائی کی توقعات پر منفی اثرات مرتب کیے۔ زری پالیسی نے معاشی عدم توازن کو دور کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے لیکن حکومت کی دیگر پالیسیوں سے اتنی مدد نہیں مل سکی۔ مستقبل میں مہنگائی پر

قاپوانے کے لیے بدلنے ہوئے معاشی حالات کے مطابق مشرکہ اور بروقت اقدامات کے ساتھ ساتھ معیشت کی پیداواری گنجائش بڑھانے کے لیے منظم کوششیں کرنا ہوں گی۔ ایسی حکمت عملی پر عملدرآمد میں تاخیر سے پالیسیوں کے نفاذ میں مشکلات حائل رہیں گی جس کا نتیجہ مطلوبہ معاشی نتائج کے بارے میں غیر یقینی صورتحال کے تسلسل کی صورت میں نکلے گا۔